ڈاکٹر مقبول صاحب

(ڈاکٹر سید مقبول احمد مرحوم)

از پروفیسر ریاض الرحمٰن خاں صاحب شروانی مرحوم

مقبول صاحب کی یاد میں جو اسوی ایشن قائم ہوئی ہے ہمارے دوست ڈاکٹر عابد رضا بیدار کے ذہن کی اُپج ہے اور آپ سب حضرات جانتے ہیں کہ وہ ایک بہت زرخیز ذہن کے مالک ہیں۔ وہ اس طرح کی چیزیں سوچتے ہیں اور پھر عمل میں بھی لے آتے ہیں۔

اپنے بزرگوں کو یاد رکھنا، ان کی یاد میں تقریبات منعقد کرنا، جس طرح ممکن ہو ان کے لیے عقیدت کے محبت کا اظہار کرنا، یہ سب زندہ قوموں کی نشانیاں ہیں۔ جو لوگ اپنے بزرگوں کو بھول جاتے ہیں، دنیا انہیں بھول جاتی ہے۔ اپنے بزرگوں کو یاد رکھنا چاہئے اور ان کی یاد کو اپنے لیے مثال بنانا چاہئے۔ ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کرنا چاہئے۔

مَیں جو مقبول صاحب کی کچھ یادیں ان سے متعلق لکھ کر لایا ہوں انہیں پڑھنے سے پہلے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں اور اس کا ذکر اس میں بھی ہے کہ آج ہم یہاں جمع ہیں، اس ہال میں، یہ لائبریری کی عمارت، اس کے برابر میں ویسٹ ایشین اسٹڈیز، یہ سب جس ایک شخص کی محنت، کوشش اور لیاقت کی سب سے زیادہ مرہون منت ہے وہ پروفیسر عبدالعلیم تھے۔ پروفیسر عبدالعلیم جب علی گڑھ تشریف لائے تو شعبۂ عربی میں صرف ایک استاد تھے۔ کوئی استاد، اسلامک اسٹڈیز نہ تھا، نہ ویسٹ ایشین اسٹڈیز تھا، نہ لائبریری تھی۔ کچھ نہیں تھا، ایک الماری تھی کتابوں کے نام پر جس میں چند کتابیں تھیں اور ہمارا شعبہ عثمانیہ ہوسٹل کی بالائی منزل کے دو یا تین کمروں تک محدود تھا۔ جب وہ شعبہ منتقل ہوا تو مَیں ایک چپراسی کے ساتھ ساری کتابیں اٹھا کر جو شعبۂ عربی کا خزانہ تھا جتنی کتابیں تھیں وہ یہاں لے آیا تھا اور یہاں لا کر کچھ الماریوں میں انہیں رکھ دیا تھا۔ سب کچھ ہوا ہے علیم صاحب کی کوششوں سے۔ ان کی محنت سے، ان کی توجہ سے، لیکن مجھے بہت افسوس ہے کہ اب تک ہماری یونیورسٹی میں ان کی کوئی یادگار نہیں، صرف ان کے اکلوتے شاگرد، پروفیسر سالم قدوائی نے ان کی یاد میں ایک مجموعہ شائع کیا ہے مضامین کا، اس کے علاوہ ان کے لیے آج تک کچھ نہیں۔

یہ بات مَیں نے بار بار کہی ہے، لکھی ہے۔ بعض وائس چانسلر صاحبان کی موجودگی میں کہی ہے کہ ان کے شایانِ شان یادگار اس یونیورسٹی میں ہونی چاہئے۔ وہ چھ برس اس یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی رہے ہیں۔ یہ بہت اچھا ہے کہ ہم مقبول صاحب کی یاد منا رہے ہیں اور ان کے لیے ہم نے سوسائٹی قائم کی ہے۔ یہ جلسہ کر رہے ہیں لیکن علیم صاحب کے کاموں کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر علیم صاحب یہاں صدر شعبہ ہو کر نہ تشریف لائے ہوتے تو مقبول صاحب بھی نہ آئے ہوتے اور بہت سے دوسرے لوگ جو اس شعبہ سے وابستہ رہے یا اسلامک اسٹڈیز یا ویسٹ ایشین اسٹڈیز میں سے، کچھ نہیں ہوتا اگر علیم صاحب نے یہ سب کچھ نہ کیا ہوتا۔

اس کے بعد اب ان کی فرمائش کے مطابق کچھ یادیں ہیں مقبول صاحب سے متعلق۔

1952ء کی جاتی ہوئی سردیاں تھیں، مَیں شام کو اپنے دوست محمد محسن قریشی صاحب کے مکان پر تھا۔ وہاں ایک چھریرے جسم اور اوسط قد کے نوجوان سائیکل پر سوار آئے، وہ سفید قمیص اور پتلون میں ملبوس تھے۔ صورت سے استاد نہیں طالب علم نظر آتے تھے۔ جب تعارف ہوا تو معلوم ہوا کہ ڈاکٹر سید مقبول احمد ہیں اور انہوں نے آکسفورڈ یونیورسٹی سے ڈی فل کیا ہے۔ انگلستان سے حال ہی میں واپس ہندستان آئے ہیں اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ عربی میں لیکچرر مقرر ہو گئے ہیں۔ مَیں اس زمانے میں اسی شعبہ میں پی ایچ ڈی کا طالب علم تھا۔ یہ معلوم کر کے ہم دونوں کو قدرتی طور پر ایک دوسرے میں کشش محسوس ہوئی لیکن اس مجلس میں گفتگو میرے اور مقبول صاحب کے درمیان کسی علمی مسئلے پر نہیں، سیاست پر ہوئی۔ آزاد ہندستان میں پہلی مرتبہ لوک سبھا اور ریاستی اسمبلیوں کے انتخابات ہو رہے تھے۔ ضلع علی گڑھ میں کسی حلقے سے کمیونسٹ پارٹی کا امیدوار بھی میدان میں تھا اور مقبول صاحب اس کے لیے کام کر رہے تھے۔ میری ہمدردی کانگریس کے ساتھ تھی، اس لیے گفتگو کا موضوع یہی رہا۔ چند ہی روز کے بعد صدر شعبۂ عربی ڈاکٹر عبدالعلیم نے مجھے پڑھانے کے لیے کلاس دے دی۔ ان دنوں شعبۂ عربی عثمانیہ ہوسٹل کی بالائی منزل کے دو تین کمروں میں محدود تھا۔ ایک استاد فرنٹ روم میں بیٹھ کر کلاس لیتا تھا اور دوسرا بیک روم میں۔ پڑھانے میں یہ احتیاط کرنی ہوتی تھی کہ آواز اتنی اونچی نہ ہو کہ دوسرے کمرے کے کام میں خلل واقع ہو۔ جب کلاس کا وقت نہیں ہوتا تھا تو ہمارے اٹھنے بیٹھنے کے لیے وہاں کوئی جگہ نہیں تھی۔ عبدالعلیم صاحب لٹن لائبریری جا کر لائبریرین سید بشیر الدین صاحب کے ساتھ چائے پیتے تھے۔ مقبول صاحب اور مَیں کیفے چلے جاتے تھے۔ اس وقت شعبۂ عربی میں صرف ایک ہی استاد اور تھے مولانا عابد الدین علوی اور وہ اتنے سینئر تھے کہ ان کا اور ہمارا کوئی جوڑ نہیں تھا اور میرے تو وہ استاد بھی رہے تھے۔

یاد آتا ہے کہ مقبول صاحب کو انڈے کے حلوے سے خاصی رغبت تھی۔ اور وہ اکثر اس سے میری تواضع کرتے تھے۔ اسی زمانے میں ہم نے جامع مسجد کے علاقے میں کسی مسئلے پر جلسہ کیا جس میں مقبول صاحب سے تقریر کرائی تھی۔ ان دنوں علی گڑھ میں رکشے نہیں چلتے تھے، یکّے اور تانگے چلتے تھے۔ چنانچہ مقبول صاحب اور میں مقررہ دن پر بعد نمازِ مغرب ایک تانگے میں بیٹھ کر وہاں کے لیے روانہ ہوئے۔ جب تانگا ریلوے روڈ پہنچا تو مقبول صاحب نے اسے رکوایا اور مجھ سے کہا آیئے پہلے نان اور کباب کھالیں پھر جلسے میں چلتے ہیں۔

1953ء میں ڈاکٹر عبدالعلیم کی کوشش اور وائس چانسلر ڈاکٹر ذاکر حسین کی کرم فرمائی سے شعبۂ عربی ظہور وارڈ میں منتقل ہو گیا۔ اسلامک اسٹڈیز کی تعلیم جو برسوں سے اس لیے معرض التوا میں پڑی ہوئی تھی کہ اس کا دائرۂ کار کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا شروع ہو گئی اور اب ہمارے شعبہ کا نام شعبۂ عربی و اسلامیات ہو گیا۔ اساتذہ کے تقررات ہونے لگے اور ہر استاد کو علاحدہ علاحدہ کمرہ مل گیا، میں بھی لیکچرر ہو گیا تھا۔ مقبول صاحب کا اور میرا کمرہ برابر برابر تھا۔ اس لیے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہمارے تعلقات زیادہ قریبی ہوتے گئے۔

وہ کئی باتوں میں ہمارے ہم خیال تھے لیکن بعض امور میں اختلاف رائے بھی تھا۔ لہٰذا کبھی کبھی بحث بھی ہو جاتی تھی۔ مقبول صاحب جلد خفا ہو جاتے تھے لیکن جلد ہی مَن بھی جاتے تھے۔ مجموعی طور پر وہ ایک اچھے دوست اور رفیق کار تھے۔

مقبول صاحب کی گھریلو زندگی بہت غیر استوار رہی۔ انہوں نے شادی انگلستان ہی میں کر لی تھی اور ان کے علی گڑھ آ جانے کے بعد ان کی بیگم اور بیٹی کو بعض قانونی پیچیدگیوں کی وجہ سے آنے میں دیر ہوئی۔ ایک مرتبہ مقبول صاحب نے ذاکر صاحب سے اس سلسلے میں بات کی اور دورانِ گفتگو کہا کہ آپ کی

حکومت ہمیں پریشان کررہی ہے۔ ذاکر صاحب نے اپنے مزاج کے مطابق فرمایا کہ جب آپ کی حکومت آجائے تو آپ ہمیں پریشان کرلیں۔ لیکن مسئلہ حل ہوگیا اوران کی بیگم اور بیٹی علی گڑھ آگئیں۔ ان کی بیگم غالباً وسط ایشیا کی تاریخ میں پی ایچ ڈی تھیں لیکن یہاں آکر انہوں نے اپنی بیٹی زہرہ کے ساتھ سائنس پڑھنی شروع کردی اور پری میڈیکل کا امتحان پاس کرکے ایم بی بی ایس میں داخلہ لے لیا اور بیٹی کے ساتھ نہ صرف ایم بی بی ایس کرلیا بلکہ اس میں سونے کا تمغہ بھی حاصل کرلیا۔ ابھی علی گڑھ میں ڈاکٹری کی اعلیٰ تعلیم کی سہولت نہیں تھی اس لیے انہوں نے اس کی تکمیل چنڈی گڑھ جاکر کی اور پھر انگلستان واپس چلی گئیں۔ مقبول صاحب تنہا رہ گئے۔ یکجائی گاہ بگاہ ہی ہوتی تھی کبھی علی گڑھ میں اور کبھی لندن میں۔ اس دوران ادارہ علوم اسلامیہ بھی قائم ہوگیا تھا۔ اس میں ایک چپراسی ملک تھے۔ مقبول صاحب نے ان کو اوران کے اہل خاندان کو اپنے مکان میں جگہ دے دی اوران کے بچوں کے کفیل بھی ہوگئے۔

برسوں بعد کی بات ہے، مقبول صاحب اور مَیں ملازمت سے سبکدوش ہوچکے تھے لیکن مقبول صاحب علی گڑھ ہی میں تھے اوران کا قیام چوراہا کیلانگر کے قریب ایک کرائے کے مکان میں تھا۔ ملک کا کئی برس پہلے انتقال ہوچکا تھا لیکن ان کے بچوں کے کفیل اب بھی مقبول صاحب تھے۔

رمضان کا مہینہ تھا۔ شام کو مَیں رکشہ میں بیٹھ کر دودھ پور کچھ خریدنے کے لیے گیا۔ جب رکشہ دودھ پور کی جانب مڑا تو دیکھا کہ اس طرف سے مقبول صاحب ہاتھوں میں پھل اور کچھ افطاری لیے ہوئے پیدل چلے آرہے ہیں۔ وہ سب سامان خورد ونوش ملک کے بچوں کے لیے تھا۔

ڈاکٹر مقبول احمد ریڈر 1954ء میں ہی ہوگئے تھے اوراسی سال ڈاکٹر عبدالعلیم پروفیسر ہوئے تھے لیکن اب ڈاکٹر مقبول کے لیے مزید ترقی کی راہیں مسدود تھیں۔ شعبۂ عربی میں ایک ہی پروفیسر شپ تھی اور آج بھی یہی صورت حال ہے۔ جب تک میرٹ پروموشن اسکیم نہیں آئی تھی۔ ایک کے علاوہ شعبۂ عربی میں کوئی دوسرا استاد علی گڑھ سے باہر جاکر ہی ترقی حاصل کرسکتا تھا۔ مقبول صاحب شملہ چلے گئے جہاں وہ سینٹر آف ایڈوانس اسٹڈیز سے منسلک ہوگئے۔ اسی زمانے سے شعبۂ اسلامیات کی تدریس شعبۂ عربی سے علاحدہ کرکے ادارۂ علومِ اسلامیہ کے سپرد کردی گئی۔ بورڈ آف اسٹڈیز کی میٹنگ میں مقبول صاحب اور مَیں نے اس کی مخالفت کی تھی لیکن فیصلہ یہی ہوا تاہم پروفیسر شپ ادارہ علومِ اسلامیہ میں بھی بہت تاخیر سے آئی۔ کچھ مدت کے بعد ایک نیا ادارہ سینٹر آف ویسٹ ایشین اسٹڈیز کے نام سے قائم ہوا اور مقبول صاحب اس کے ڈائریکٹر مقرر ہوکر علی گڑھ واپس آگئے۔ انہوں نے اس ادارے کا کام اپنے مزاج کے مطابق بہت انہماک اور قابلیت سے انجام دیا اوراس کے استحکام اور ترقی کے لیے انتھک جدوجہد کی۔ اسی زمانے میں وہ یو جی سی کے ممبر بھی رہے اوراس کے کاموں میں بہت دلچسپی لی۔

1979ء میں ساٹھ سال کی عمر کو پہنچنے پر وہ یونیورسٹی کی ملازمت سے سبکدوش ہوگئے لیکن انہیں کشمیر یونیورسٹی میں ملازمت مل گئی اور وہ سری نگر چلے گئے۔ وہاں انہوں نے سینٹر آف ویسٹ ایشین اسٹڈیز قائم کیا اور اس کے سربراہ مقرر ہوگئے۔ انہوں نے بالخصوص اس سینٹر کا میوزیم بہت تلاش وجستجو، مہارت اور سلیقے سے تشکیل دیا۔ 1980ء میں کشمیر یونیورسٹی میں عربی کے شعبہ کی تاسیس ہوئی اور مقبول صاحب ہی اس کے بھی نگراں قرار پائے۔ انہوں نے اس شعبے کے لیے جو نصاب مرتب کیا اس کی دو خصوصیات ایسی تھیں جو میرے علم کی حد تک کسی دوسری یونیورسٹی میں نہیں پائی جاتی تھیں۔ اور شاید اب بھی نہیں پائی جاتی ہیں۔ انہوں نے ہر سیمسٹر ایک پرچہ عربی لکھنے اور بولنے کے لیے مخصوص کیا۔ دوسرے ہر ہفتے کسی ایک طالب علم کو کسی طے شدہ موضوع پر مقالہ لکھ کر لانا ہوتا تھا جو وہ کلاس میں پڑھ کر سناتا تھا اوراس پر گفتگو ہوتی تھی جس میں سب طلبا اور اساتذہ حصہ لیتے تھے۔ 1982ء میں اس شعبے کو پروفیسر شپ ملی اوراس کے لیے نظر انتخاب مجھ پہ پڑی۔ مَیں نہیں کہہ سکتا کہ اس انتخاب میں وائس چانسلر، پروفیسر وحیدالدین ملک کا کتنا حصہ تھا اور مقبول صاحب کا کتنا، لیکن اس معاملے میں مجھ سے ساری گفت وشنید مقبول صاحب نے ہی کی۔ ملک صاحب کی تحریری پیشکش تو بالکل آخری مرحلے پہ آئی۔ بہر حال مَیں 1983ء کے شروع میں وہاں پہنچ گیا اوراس طرح ایک بار پھر مجھے مقبول صاحب کا قرب حاصل ہوگیا۔

پروفیسر مقبول احمد 1984ء کے آخر تک سری نگر میں رہے۔ جس طرح علی گڑھ میں انہوں نے ایک خاندان کی سرپرستی کی تھی اسی طرح سری نگر میں بھی اپنے ادارے کے ایک چپراسی کو مع اس کے خاندان کو اپنے گھر پر رکھ لیا لیکن مَیں نے محسوس کیا کہ یہ خوش دلی کا نہیں مجبوری کا سودا تھا۔ مقبول صاحب کو وہاں جو مکان ملا ہوا تھا وہ کافی بڑا تھا اوران کے لیے اس میں تنہا رہنا کافی دشوار تھا۔ انہوں نے ایک دن مجھ سے اس چپراسی کی شکایت کی کہ ہر روز ایک کلو گوشت لاتا ہے، مَیں اس میں سے کتنا کھالیتا ہوں۔ مَیں نے ان سے کہا مقبول صاحب آخر خود اسے اور اس کے بیوی بچوں کو بھی تو گوشت کھانا ہوتا ہے۔

مقبول صاحب نے اپنی خودنوشت ''برگ گل'' میں اپنے سری نگر کے تین دوستوں کا خاص طور پر ذکر کیا ہے۔ شعبۂ قانون کے صدر پروفیسر شاہد صدیقی، شعبۂ سیاسیات کے صدر ڈاکٹر محمد سلیم قدوائی اور شعبۂ فارسی کے استاد ڈاکٹر آصف نعیم صدیقی۔ مقبول صاحب کا مکان کیمپس کے باہر واقع تھا لیکن ان کی شامیں کیمپس میں گزرتی تھیں۔ کیمپس میں وہ بیشتر ڈاکٹر سلیم قدوائی کے کوارٹر میں نشست کرتے تھے اور ہمیں بھی وہاں بلا لیتے تھے۔ سلیم قدوائی سے زیادہ ان کی بیگم ہماری خاطر تواضع کرتی تھیں۔ مقبول صاحب کافی رات گئے اپنی قیام گاہ واپس جاتے تھے اور ان کے نوجوان دوستوں کو وہاں تک ان کی مشایعت کرنی ہوتی تھی۔

مقبول صاحب کے ساتھ بناؤ بگاڑ کا سلسلہ سری نگر میں بھی جاری رہا۔ یہاں مَیں صرف ایک واقعہ کا ذکر کرنا چاہوں گا۔ یہ ذکر نسبتاً ذرا تفصیلی ہے لیکن اس سے وہ نتیجہ نکلتا ہے اس کی خاطر مَیں آپ کو زحمت دوں گا اس کے سننے کی۔ انہوں نے شعبۂ عربی کی کشمیر یونیورسٹی کی تشکیل گوشے گوشے سے مردان کار جمع کرکے کی تھی۔ وہاں پوسٹ گریجویٹ شعبے کے قیام سے پہلے عربی سرٹیفکیٹ اور ڈپلوما کی تعلیم کا انتظام تھا اوراس خدمت کے لیے دو استاد مقرر تھے۔ مقبول صاحب نے انہیں پوسٹ گریجویٹ ڈپارٹمنٹ میں لے لیا اور لیکچرر شپ مل گئی۔ ایک لیکچرر کی اسامی کسی دوسرے شعبہ میں خالی پڑی تھی وہ اس شعبے کو منتقل ہوگئی اوراس پر ایک صاحب کا عارضی تقرر ہوگیا۔ مقبول صاحب کے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ابتدائی دور کے ایک شاگرد کشمیر میں کسی کالج میں استاد تھے۔ جب وہ پچپن برس کے ہوئے تو اس وقت کے ملازمت کے قواعد کے مطابق ملازمت سے سبکدوش ہوگئے مگر مقبول صاحب نے انہیں سینٹر آف ویسٹ ایشین اسٹڈیز میں ریسرچ اسسٹنٹ مقرر کردیا اور سال دو سال ان کی توسیع ہوتی رہی۔ انہیں مشاہرہ تو سینٹر سے ملتا تھا لیکن مقبول صاحب ان سے کام شعبۂ عربی میں لیتے تھے۔

مَیں جب سری نگر پہنچا تو شعبۂ عربی کی یہ ساخت تھی جیسا کہ عرض کیا۔ اس وقت تک کالجوں میں ریٹائرمنٹ کی عمر پچپن برس تھی لیکن یونیورسٹی میں ساٹھ برس۔ میرے وہاں پہنچتے پہنچتے مقبول صاحب کے وہ شاگرد ساٹھ برس کے ہوچکے تھے اور پھر جلد ہی خود مقبول صاحب بھی یونیورسٹی کی ملازمت سے سبکدوش ہوگئے۔ انہیں خیال ہوا کہ اب سینٹر میں ان کے جانشیں غالباً ان کے شاگرد کی مزید توسیع کے لیے کوششیں نہیں کریں گے، اس لیے انہوں نے مجھ سے فرمائش کی کہ آپ وائس چانسلر صاحب سے کہیں کہ انہیں شعبۂ عربی میں مستقل ملازم کرلیں۔ مَیں نے کہا کہ اول تو شعبے میں کوئی اسامی ہی نہیں ہے، دوسرے ان کی عمر ساٹھ برس ہوچکی ہے، انہیں مستقل طور پر کیسے رکھا جاسکتا ہے۔ لیکن مقبول صاحب کا اصرار جاری رہا۔ بالآخر مَیں نے وائس چانسلر صاحب سے بات کی، انہوں نے بھی وہی کہا جو مَیں پہلے سے کہہ رہا تھا لیکن مقبول صاحب کو بدگمانی ہوئی کہ مَیں نے پوری کوشش نہیں کی اور وہ مجھ سے خفا ہوگئے۔ تاہم اس واقعہ سے یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ انہیں اپنے شاگردوں سے کتنی ہمدردی تھی اور وہ ان کے لیے کس حد تک جانے کو تیار رہتے تھے۔

مقبول صاحب کے سری نگر چلے جانے کے بعد ایک مرتبہ مَیں نے انہیں اپنے شعبے میں جو دراصل ان ہی کا شعبہ تھا، لیکچر دینے کے لیے بلایا۔ وہ تشریف لائے، لیکچر دیے، کئی روز وہاں مقیم رہے اور بہت خوش رہے۔ یہاں یہ عرض کرنا غیر مناسب نہیں ہوگا کہ پروفیسر مشیر الحق کی وائس چانسلری کے دوران کشمیر یونیورسٹی نے مقبول صاحب اور پروفیسر آل احمد سرور صاحب کی

خدمات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان دونوں کے علمی مرتبے کا اعتراف انہیں ڈاکٹر آف لٹریچر کی اعزازی ڈگری دے کر کیا۔ جب مَیں 1988ء میں کشمیر یونیورسٹی کی ملازمت سے سبکدوش ہوکر علی گڑھ واپس آیا تو اس وقت مقبول صاحب جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کے ڈائریکٹر کی خدمت انجام دے رہے تھے۔ وہاں جانے پر ان سے ملاقات ہوتی تھی اور وہ لطف وکرم کا برتاؤ کرتے تھے۔ اس کے بعد جب وہ علی گڑھ آ گئے تو مختلف تقریبوں اور جلسوں میں ان سے ملاقات ہوتی رہی۔ ان کے مکان پر بھی جانے کا اتفاق ہوا لیکن وہ جس تنہائی اور ایک گونہ بے بسی کی زندگی بسر کر رہے تھے اس سے طبیعت خوش نہیں ہوئی۔ آخر میں وہ اُردن چلے گئے جہاں انہیں ایک یونیورسٹی کے قیام میں تعاون کے لیے مدعو کیا گیا۔

یہ کتنا بڑا اعزاز ہے کہ کوئی عرب ملک ہندستان کے کسی عربی کے عالم کو اپنی گراں قدر خدمت کے لیے منتخب کرے۔ وہاں دورانِ قیام وہ علیل ہو گئے اور اس علالت نے مرض الموت کی صورت اختیار کر لی۔ وہ علاج کی غرض سے اپنی بیوی بچوں کے ساتھ لندن میں بھی رہے لیکن ان کا انتقال ہندستان واپس آ کر ہی ہوا۔ پروفیسر مقبول احمد نے جتنا علمی معیار کا کام کیا اس کے جائزے کا یہ موقع نہیں ہے۔ تاہم یہ ضرور ہے کہ اگر انہوں نے زیادہ مستحکم گھریلو زندگی گزاری ہوتی اور اس قدر نقل مکانی نہ کی ہوتی تو اپنی صلاحیت کے مطابق اس سے زیادہ اور بڑا کام کرتے۔ تنازعات مقبول صاحب کے ساتھ ہر جگہ رہے۔ کبھی کبھی تو محسوس ہوتا تھا کہ وہ شاید تنازعات کو خود دعوت دیتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ انہوں نے جتنی مدت انگلستان میں گزاری تھی اور وہاں کے طرزِ حیات اور تمدن سے جس قدر عادی ہو گئے تھے، اس کا اثر تھا کہ وہ انگلستان اور ہندستان کی معاشرت کا فرق ملحوظ نظر نہیں رکھتے تھے۔ کتنی باتیں ہیں کہ جو مغرب میں اس طرح قبول کر لی گئی ہیں گویا زندگی کا حصہ بن گئی ہیں لیکن مشرق ابھی تک ان کا متحمل نہیں ہے۔ بالخصوص ہمارے یہاں لوگوں کے ذہنوں میں عربی اور اسلامیات کے اساتذہ کی ایک خاص شبیہ ہے جس سے انحراف گوارہ نہیں ہوتا ہے۔ اس کے برعکس مقبول صاحب کی رائے تھی کہ عربی اور اسلامیات بھی اسی طرح ڈسپلن ہیں جس طرح دوسرے ڈسپلن ہیں۔ ان کے عالموں کے لیے مسلمان ہونا بھی ضروری نہیں ہے۔ چہ جائے کہ باعمل مسلمان ہوں۔ معلوم ہوا کہ انہوں نے تاریخ ادب عربی پر لیکچر دیتے ہوئے جاہلی دور کے بارے میں کہا تھا کہ وہ اتنا تاریک نہیں تھا جتنا تاریک بیان کیا جاتا ہے۔ اسے طلبا نے اسلام کے کارنامے کی تخفیف پر محمول کیا اور ہنگامہ ہو گیا۔ مقبول صاحب بددل ہو کر شعبہ سے کنارہ کش ہو گئے۔ بہر حال وہ ایک پاک دل اور پاک باطن مسلمان تھے۔ یوں کمزوریاں کس میں نہیں ہیں۔

☆

مقبول صاحب-۲

از پروفیسر یاسین مظہر صدیقی مرحوم

بظاہر پروفیسر مقبول صاحب سے میرا تعلق نہ ہونا چاہیے تھا۔ اس لیے کہ ہم دونوں کی دنیائیں بالکل مختلف تھیں لیکن علمی دنیا میں اور کبھی کبھی سکونت کی دنیا میں متضاد لوگ بھی جمع ہو جاتے ہیں اور اگر شرافت درمیان میں موجود ہو تو تعلقات بھی بہت اچھے ہو سکتے ہیں۔

مقبول صاحب سے میری ملاقات شروع میں ہمارے ایک بہت ہی عزیز دوست پروفیسر مسعود الرحمٰن خان ندوی صاحب کے ذریعہ ہوئی۔ وہ میرے ندوہ کے ساتھی تھے اور وہ جب یہاں علی گڑھ ریسرچ کے لیے تشریف لائے تو مقبول صاحب کی نگرانی میں وہ پی ایچ ڈی کر رہے تھے اور موضوع تھا ''ابن کثیر کی تاریخ نگاری''۔ مسعود صاحب سے میرے تعلقات بہت زیادہ تھے۔ لہٰذا مقبول صاحب کے یہاں جب وہ کبھی جاتے تو مجھے بھی ساتھ لے جایا کرتے تھے۔ اس طرح ان سے ملاقاتیں ہونا شروع ہو گئیں اور ان کی شرافت سے مَیں بے پناہ متاثر ہوا۔ مقبول صاحب کے یہاں مسعود صاحب تقریباً روزانہ جاتے تھے اور مسعود صاحب اگر نہیں جا سکتے تو مقبول صاحب ان کے یہاں آ جاتے تھے۔ اور ان کے گھر میں اسی طرح سے پذیرائی ہوتی تھی جس طرح ایک خاندان کے بڑے شخص کی ہوتی ہے۔ استاد کا درجہ بھی انہیں حاصل تھا اور وہ مسعود صاحب کے بچوں کے ساتھ بے انتہا محبت کا سلوک فرماتے تھے۔ گھنٹوں نشست رہا کرتی تھی۔ اس دوران بڑی اچھی باتیں ہوتی تھیں۔ اس میں علمی باتیں بھی ہوتی تھیں، مذہبی باتیں بھی ہوتی تھیں اور بہت سے دوسرے مسائل بھی آتے تھے۔ ایک تو یہ جہت تھی ہماری ملاقات کی۔ دوسری ذاتی جہت تھی کہ جب وہ علی گڑھ قلعہ نگر چوراہے کے پاس بنرجی کے مکان میں رہنے لگے تو میرے پڑوس میں آئے تھے اور وہ ان واحد انسان دوست پروفیسروں میں تھے جو اپنے چھوٹوں کے یہاں جانے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے تھے۔

علی گڑھ میں مزاج ہمیشہ یہ رہا ہے، جس کو زمیندارانہ مزاج کہہ لیجئے یا حکمرانی کا مزاج کہ بڑا استاد چھوٹے استاد کے یہاں جانا پسند نہیں کرتا۔ اگر بڑا پروفیسر ہے تو جونیئر پروفیسر کے یہاں نہیں جاتا تھا یہ کسی خاص طبقے یا شخص کے بارے میں نہیں کہ وہ کسی خاص طبقے سے متعلق ہے۔ شعبۂ اسلامیات سے متعلق ہے کہ اس کا پروگریسیو گروپ سے تعلق ہے۔ ہر ایک طبقے میں یہ زمیندارانہ مزاج موجود تھا۔ بزرگوں میں یہ بات صرف دو تین میں دیکھی۔ کہنے میں کوئی عذر نہیں کہ حاجی عبیدالرحمٰن صاحب (شروانی) کے یہاں ایک مزاج تھا، عجیب وغریب مزاج تھا کہ وہ زمیندار ہونے کے باوجود، نواب ہونے کے باوجود چھوٹوں کے یہاں جانے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے تھے۔ بڑی ان سے ملاقاتیں رہیں۔ ایک اکبرآبادی صاحب مرحوم تھے۔ مقبول صاحب کا یہ معاملہ تھا کہ جب ان سے تعلقات ہوئے تو کبھی صبح کبھی شام کو تشریف لے آئے۔ گفتگو ہوتی تھی۔ اتفاق سے ہم دونوں کا ایک مشترکہ موضوع تھا۔ مَیں اسلامک ہسٹوریوگرافی اور جغرافیہ پڑھاتا تھا، جب سے مَیں اسلامک اسٹڈیز میں آیا، جغرافیہ کا بھی مضمون تھا۔ وہ اکثر بڑی محنت سے بتاتے تھے نہ صرف اسلامک جغرافیہ کے بارے میں، مسلم جغرافیہ کے بارے میں، جو ان کا خاص موضوع تھا، بلکہ اسلامک ہسٹوریوگرافی کے بارے میں بھی۔ اس زمانے میں مسعودی پر انہوں نے ایک کتاب شائع کی تھی اور ان کو بہت دلچسپی بھی تھی۔ مَیں جس زمانے میں مسعودی کو پڑھا رہا تھا تو مَیں نے ایک دن ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ مسعودی نے کوئی کتاب جغرافیہ پر نہیں لکھی ساری کتابیں ان کی تاریخ پر ہیں اور تاریخ ہی سے ان کے جغرافیہ کے مسائل اور مہمات نکالے گئے ہیں۔ کہا کہ بھئی میرے پاس الگ کتاب آئی ہے خالدی کی، بہت اچھی ہے مسعودی پر، وہ اسلامک ہسٹوریوگرافی ہے۔ نیا پرس پیکٹواس میں پایا جاتا ہے وہ میرے پاس موجود ہے، آپ کسی وقت میرے پاس آیئے میں دے دوں گا۔ فوراً انہوں نے مجھے کتاب دے دی۔ مَیں نے کہا ڈاکٹر صاحب اگر اجازت دیں تو فوٹو اسٹیٹ کروالوں۔ کہنے لگے بالکل، آپ یہ فوٹو اسٹیٹ کروالیں۔ اور جغرافیہ میں غالباً جو ماہرین سمجھے جاتے تھے ان میں سے ان کا شمار ہوتا تھا۔ صرف اسلامی اور عرب جغرافیہ میں نہیں بلکہ جغرافیہ بحیثیت مضمون میں بھی ان کی بڑی اہمیت تھی۔ بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جنہیں اتنا تبحر حاصل ہوگا جغرافیہ کے مسائل میں۔ ان کے بہت سے مضامین شائع ہوئے اور ان مضامین میں بہت سی باتیں انہوں نے کہیں۔ ظاہر بات ہے کہ علمی اختلافات الگ ہوتے ہیں اور بہت سے اختلافات کیے جا سکتے ہیں، کیے جانے بھی چاہئیں۔

پروفیسر ریاض الرحمٰن صاحب نے ابھی ایک بات کہی کہ وہ تنازعات کو کبھی کبھی دعوت دیتے تھے۔ یہ بات بالکل صحیح ہے۔ وہ کبھی کبھی چھیڑنے کے لیے کوئی بات کہہ دیتے تھے۔ لیکن کبھی کبھی یہ چھیڑ چھاڑ اتنی دور تک چلی جاتی تھی کہ مسائل کھڑے ہو جاتے تھے۔ اب تک مجھے یاد ہے کہ عابد رضا بیدار صاحب نے خدا بخش لائبریری میں ایک سمینار کروایا تھا۔ مقبول صاحب نے گفتگو کرتے ہوئے ایک بات چھیڑ دی، کیونکہ وہاں ایک خاص طبقہ چاہتا تھا کہ ہنگامہ ہو۔ لہٰذا انہوں نے مقبول صاحب اور مولانا عبدالسلام صاحب رامپوری دونوں کے بیانوں کو غلط طریقے سے شائع کر کے ایک ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ مقبول صاحب بے چارے بہت پریشان کہ مَیں نے تو بھئی ایک علمی بات کہی تھی اس کو کس طرح سے لوگوں نے اٹھایا۔ بہرحال ہم نے لوگوں سے ایک باقاعدہ میٹنگ کی۔ اس میٹنگ میں یہ فیصلہ کیا کہ اصل بات یہ تھی۔ اس بیان پر ایک پریس ریلیز شائع کیا گیا جس پر تمام شرکائے سمینار کے دستخط تھے۔ مَیں یہ اس بنا پر کہہ رہا ہوں کہ عام طور سے جو ہمارے یہاں نظریوں کے بارے میں غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں وہ ذرا دُور ہو جائیں۔

مقبول صاحب کے یہاں ایک اور بڑی چیز تھی جو میرا اُن کا مطالعہ رہا، خاص طور سے جو تعلقات رہے وہ اسلامک اسٹڈیز کانفرنس کے بارے میں۔ وہ اس کے عہدیدار بھی تھے، نائب صدر بھی رہے اور حضرت علی میاں صاحب سے ان کا بہت بڑا تعلق تھا۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی صاحب اور ان سے بہت تعلقات کی وجہ سے وہ اس میں شریک ضرور ہوتے تھے۔ پابندی سے شریک ہوتے تھے اور ان کے مقالات بہت اچھے ہوا کرتے تھے۔ ان مقالات میں اور اسلامک اسٹڈیز کانفرنس میں مقبول صاحب نے ہمیشہ ایک بڑے اچھے اسکالر کی حیثیت سے شرکت کی اور ان کی وہاں بہت سی دوسری چیزیں بھی سمجھنے میں آئیں۔

مَیں جب آفتاب ہوسٹل میں رہتا تھا تو ایک صاحب جغرافیہ میں تھے، وہاں گفتگو ہونے لگی کہ انٹلیکچول کون کون سے علی گڑھ میں پائے جاتے ہیں۔ اس میں بہت سے لوگوں کا نام آیا جب مقبول صاحب کا نام آیا اتفاق سے تو انہوں نے کہا نہیں نہیں پہلے دو چار برس تک تو انٹلیکچول ہوئے، پھر اب نہیں رہے۔ مَیں نے کہا کہ بھئی یہ انٹلیکچولزم سے ان کا زوال کیسے ہو گیا، کہنے لگے صاحب وہ حج کر آئے اب انٹلیکچول کہاں رہ گئے، تو غیر حاجی جتنے ہیں وہ سب انٹلیکچول ہیں۔

مقبول صاحب کے یہاں صلح کل کا مسئلہ تھا۔ نہ تو وہ آدم بیزار تھے اور نہ مذہب بیزار تھے۔ نہ ان کی تعلیم و تربیت ایسی ہوئی تھی۔ ایک خاص مزاج ان کا ڈھل گیا تھا، اس مزاج کے مطابق وہ رہتے تھے۔ ہم لوگوں کے ساتھ پھنس جائیں تو وہ نماز بھی پڑھتے تھے۔ چنانچہ جتنی اسلامی کانفرنسیں ہوئی ان میں وہ ہر نماز میں صف اول میں موجود رہا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ ہم لوگوں سے جو گفتگو ہوتی تھی بہت اچھی دلچسپ باتیں کرتے تھے۔ مَیں نے ان کو دیکھا کہ حضرت مولانا علی میاں صاحب سے ان کا بہت گہرا تعلق تھا اور ان کا بہت احترام فرماتے تھے۔ مولانا علی میاں صاحب بھی مقبول صاحب کا بہت احترام کرتے تھے۔ اس وجہ سے یہ بھی بہت اہم بات تھی کہ ایک دوسرے کے احترام میں، ایک دوسرے کے خیالات کا بھی اعتبار کیا جاتا تھا اور ہمیشہ وہ صلح کل کی پالیسی جس کے لیے صوفیا کو ایک بہت اہم درجہ حاصل ہے اس پالیسی پر وہ عمل پیرا تھے اور کبھی کبھی وہ ایسی باتیں کیا کرتے تھے جو نہ اِدھر کے لوگوں کو پسند آتی تھیں اور نہ اُدھر کے لوگوں کو۔ ایک ادیب نے کہا ہے، اور ایک بڑی دلچسپ بات ہے کہ اگر آپ کسی ایک سائڈ میں نہیں چل رہے ہیں اور بیچ سڑک پر چل رہے ہیں تو ہمیشہ حادثے کا شکار ہوں گے۔ یا تو اِدھر ٹریفک مارے گی یا اُدھر ٹریفک مارے گی۔ مقبول صاحب کا معاملہ یہی تھا کہ وہ بیچ سڑک پر چلنے کی کوشش کرتے تھے اور اس کے نتیجے میں بڑے مسائل پیدا ہوتے تھے۔

مقبول صاحب جب کئی بار میرے گھر تشریف لا چکے تو مجھے یہ خیال ہوا کہ مجھے بھی جانا چاہئے اور ان کے گھر پر حاضری دینی چاہئے۔ میری اہلیہ نے مجھے لعن طعن بھی کیا کہ اتنا بڑا آدمی، اتنا بڑا استاد تمہارے یہاں آتا ہے تم جاتے بھی نہیں ہو، یہ کیا حرکت ہے۔ فوراً اس رات مَیں ان کی خدمت میں بغیر سوچے سمجھے مغرب بعد چلا گیا۔ وہ جس مکان میں رہتے تھے وہ بہت چھوٹا مکان تھا اور وہاں ان کے چپراسی کے بچے جیسا کہ ریاض الرحمٰن صاحب نے فرمایا وہ رہا کرتے تھے، مَیں دروازے پر جب پہنچا تو کھڑکی کھلی ہوئی تھی اور دروازہ بھڑا ہوا تھا تو مَیں نے نوک کیا، مقبول صاحب چارپائی پر لیٹے ہوئے کچھ پڑھ رہے تھے۔ انہوں نے پوچھا کون، مَیں نے عرض کیا یاسین مظہر۔ سب سے پہلے انہوں نے کہا آیئے آیئے اور فوراً گلاس جو ان کی میز پر یا تپائی پر رکھا تھا وہ اٹھا کر انہوں نے نیچے رکھ دیا۔ مجھے کچھ شرمندگی محسوس ہوئی کہ مَیں شاید غلط وقت پر آ گیا۔ خیر خود ہی دروازہ کھولا اور بہت اچھی باتیں کرتے رہے۔ کچھ شرمندگی تھی۔ بہت دیر انہوں نے بٹھائے رکھا، چائے وائے پلائی اور گفتگو کی، علمی باتیں کی، کچھ اچھی باتیں، کچھ پرانی یادیں تازہ کیں۔ جب میں گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے بعد چلنے لگا تو مَیں نے کہا، ڈاکٹر صاحب مَیں بہت معافی چاہتا ہوں کہ ایسے وقت میں حاضر ہو گیا معلوم نہیں تھا اور کچھ مخل ہوا آپ اسے جاری رکھئے۔ کہنے لگے کہ بھئی میں مزید آرام کرنا نہیں چاہتا تھا۔ تو مَیں نے یہ طے کر لیا کہ مَیں اب کبھی مزید آرام کرنے کے وقت مخل نہیں ہوں گا۔ ڈاکٹر صاحب جہاں جایا کرتے تھے ایک بار وہاں مجلس میں کھانے کی دعوت ہوئی اور کچھ گفتگو یہ ہوئی کہ کچھ ایسی چیزیں بھی ہوں میز پر۔ جغرافیہ کے یا ویسٹ ایشین اسٹڈیز کے۔ کچھ اساتذہ موجود تھے عسکری صاحب تھے، علی محمد صاحب تھے۔ دو تین اور حضرات تھے مسعود صاحب کے یہاں کھانے پر۔ بحث ہوئی کہ بھئی میز پر اگر کوئی شخص کچھ کھا پی رہا ہے تو آپ کو کیا اعتراض۔ مقبول صاحب نے کہا نہیں مجھے اعتراض ہے، بھئی جو لوگ نہیں کھاتے پیتے ہیں ان کو کیوں پریشان کیا جائے، ان کے سامنے کیوں کھایا پیا جائے۔ یہ ان کے سوچنے کا انداز تھا کہ دوسرے جو حاضر ہیں، موجود ہیں، جو ساتھ اٹھتے بیٹھتے ہیں، آپ ان کے جذبات کو کیوں ٹھیس پہنچائیں۔ جو ہمارے یہاں اب یہ سمجھا جاتا ہے کہ ہم جب تک کسی کو ٹھیس نہ پہنچائیں، اس وقت تک ہماری روشن خیالی یا ہماری علویت اُجاگر نہیں ہوسکتی۔ جب تک ہم دوسرے کے جذبات کو ٹھیس نہ پہنچائیں۔ مَیں نے مقبول صاحب میں دیکھا کہ اس کا ہمیشہ بہت خیال فرماتے تھے کہ کسی کو بلاوجہ تنگ نہ کیا جائے، بلا وجہ کوئی ایسی بات نہ کی جائے، کوئی ایسا کام نہ کیا جائے جس سے کسی کو تکلیف پہنچے اور وہ خود اپنے اعمال پر اور افعال پر بہت قدرت رکھتے تھے۔ کبھی اس قسم کا کوئی موقع نہیں آنے دیتے تھے کہ ان کے کام سے یا ان کی گفتگو سے کسی کو تکلیف پہنچے۔

مقبول صاحب کے بارے میں اور بھی بہت سی باتیں مجھے یاد ہیں لیکن یہ موقع نہیں ہے، کبھی انشاء اللہ لکھنے کا موقع آئے گا تو مَیں ان کے بارے میں ضرور کچھ باتیں عرض کروں گا۔ آخر میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ وہ ایک بہت بڑے اسکالر، بہت بڑے عالم اور اس سے زیادہ شریف النفس انسان تھے۔ علی گڑھ میں جو روایتیں قائم ہوئی ہیں علمی، تہذیبی، تمدنی وہ ان جیسے ہی لوگوں کی وجہ سے قائم ہوئی ہیں۔ جنھوں نے یہ سوچے بغیر ان کے شاگرد، ان کے ملنے والے، ان کی جان پہچان کے لوگ، دوست کس نقطۂ نظر کے حامل ہیں، کیا سوچتے ہیں، کیا کرتے ہیں، وہ ہر ایک سے ملتے تھے۔ اور ایک چیز مَیں نے ان کے یہاں بہت زیادہ دیکھی کہ وہ ہر ایک شخص کی علمی مدد کرنے کے لیے تیار رہتے تھے۔ یہ ایک استاد کا ایک گرو کا فرض ہوتا ہے اور یہ اس کا مقام ہوتا ہے۔

ظاہر بات ہے کہ مقبول صاحب بھی ایک انسان تھے اور خرابیاں ان میں بھی تھیں، ہم میں بھی ہیں۔ ان کو اپنی خرابیوں کا شاید زیادہ احساس تھا، ہم کو اپنی خرابیوں کا ابھی تک احساس نہیں ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے یہاں علی گڑھ میں روایتیں خراب ہوتی جا رہی ہیں اور علمی، تہذیبی اور اخلاقی معیار بھی گرتا جا رہا ہے۔ بلاشبہ مقبول صاحب جیسے لوگوں کی ضرورت ہے ہمیں۔ اس سے دلچسپی نہیں کہ مقبول صاحب کس نقطۂ نظر کے حامل تھے۔ بہت سے مسائل میں ایسی جزو کو دیکھنا چاہئے لیکن علی گڑھ کے ایک استاد کی حیثیت سے ایک ایسے استاد کی ضرورت ہے جو استاد کی حیثیت سے رہے جو سب کے کام آوے۔

مقبول صاحب میں یہ ایک بڑی صفت تھی، سب کے کام آتے تھے، سب سے ملتے تھے، سب سے تعلقات رکھتے تھے اور دوسروں کے ساتھ ہمیشہ اچھا اور شرافت کا سلوک فرماتے تھے جو عام طور سے یہاں لوگوں میں نہیں پایا جاتا ہے۔

ہم مردہ پرست لوگ تو ہیں ہی، بہت ہی تاخیر سے کسی شخص کی عظمت کو تسلیم کرنا پسند کرتے ہیں۔ پروفیسر ریاض الرحمٰن خاں شروانی صاحب نے صرف پروفیسر عبدالعلیم صاحب کا ذکر کیا، مَیں شعبۂ تاریخ کا پروردہ ان ہی کا طالب علم رہا ہوں۔ فرخ جلالی صاحب جانتے ہیں میرے سینئر رفیق کار رہے پروفیسر نورالحسن صاحب کا جو تعلق تھا اور یونیورسٹی میں ان کی خدمات ہیں آج اس کا کوئی اعتراف کرنے والا نہیں پایا جاتا۔ شعبۂ تاریخ کو بھی توفیق نہیں ہو رہی ہے کہ ان کا اعتراف کرے۔ یہاں تو لمبی فہرست ہے اساتذۂ کرام کی محسنین کی، اس یونیورسٹی کو بنانے والوں کی، جن کی خدمات کو ہم پہچاننا نہیں چاہتے۔ مجھے یہ خوشی ہے کہ عابد رضا بیدار صاحب نے یہ سلسلہ شروع کیا ہے اور جیسا کہ شروانی صاحب نے فرمایا امید یہ ہے کہ آئندہ ایسے لوگوں کا جو اس یونیورسٹی کے بڑے محسنین، بڑے اساتذہ رہے ہیں ان کو بھی ان کا مقام دیا جائے گا اور یہ بات طے ہے کہ ان کا مقام آپ دیں یا نہ دیں ان کے مقام میں تو اب کوئی اضافہ ہونے والا نہیں لیکن آپ کی شرافت کا ثبوت ضرور ملے گا۔

علی گڑھ یونیورسٹی کی مولانا آزاد لائبریری کے ڈاکٹر امجد علی صاحب کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے، جنہوں نے بڑی محنت اور محبت سے اس جلسے کی روداد ٹیپ سے تحریر میں منتقل کی، بہت مشکل کام تھا، امجد صاحب ہی کر سکتے تھے۔ ان کی شکرگزاری واجب ہے۔

☆

مقبول صاحب-۳

از پروفیسر عارف رضوی

اس بزم میں یا تو مقبول صاحب کے دوست ہیں یا نیاز مند، اور یہ مَیں فخر کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ غالباً عمر کے اعتبار سے ان کے نیازمندوں میں سب سے زیادہ عمر کا مَیں ہوں۔ تو یہ قرعہ فال نکلا میرے نام میں کہ مَیں مقبول صاحب کی یاد میں کچھ عرض کروں۔

سب سے پہلے یہ عرض کروں کہ تعلیم کے بعد مَیں تقریباً سڑکوں پہ تھا۔ کچھ دنوں نیشنل کونسل آف اپلائیڈ اکنامک ریسرچ کے پروجیکٹ میں کام کیا پھر اس کے بعد پروفیسر دھرما کمار کے ساتھ دلی اسکول آف اکونومکس میں ایک پروجیکٹ میں۔ لیکن پروجیکٹ ایک مقررہ وقت کے لیے ہوتے ہیں، اس کے بعد آدمی کو فکر ہو جاتی ہے کہ اب میرے روزگار کا کیا ہوگا۔ مَیں کہاں کام کروں گا۔ مقبول صاحب سے ملاقات ہوئی اور خدا جانے انہیں کیا دھوکا ہوا کہ انہوں نے مجھ سے کہہ دیا کہ تم علی گڑھ آؤ اور ایک سینٹر یہاں نیا قائم ہوا ہے اور اس میں جگہیں ہیں، عرضی دو تو دیکھتے ہیں۔ اور اس کے بعد 1971ء میں میرا یہاں تقرر ہوا۔ مقبول صاحب یہاں ڈائریکٹر تھے۔ اتفاق کی بات یہ ہے کہ پروفیسر اگوانی صاحب جس سلیکشن کمیٹی میں میرا تقرر ہوا تشریف لائے تھے۔ اس بات کا اعتراف کرنا چاہتا ہوں، نہایت ایمانداری کے ساتھ کہ جس کسی نوجوان آدمی کا یونیورسٹی سسٹم میں یا تعلیمی ادارے میں کوئی تقرر کرتا ہے تو اس امید کے ساتھ کرتا ہے کہ وہ پڑھے گا اور بہت ریسرچ کرے گا، علم کی دنیا میں اس کا کوئی کنٹری بیوشن ہوگا اور مَیں سمجھتا ہوں کہ اگر مَیں نے اعتراف نہیں کیا تو مجھے لگے گا کہ مجھے بہت اذیت ہوگی کہ آج مجھے اس بات کا احساس ہو رہا ہے کہ مَیں مقبول صاحب کی توقعات کو پورا نہ کر سکا اور نہ اگوانی صاحب کی۔ اپنی جیسی کوشش مَیں نے ضرور کی اور اس بات کی مجھے شرمندگی ہے اور مَیں سَر آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اب جو میرے پاس بچا ہوا وقت ہے اس لیے میں پھر سے ارادہ کرتا ہوں اور مَیں کوشش کروں گا کہ تھوڑا سا پڑھ لکھ لوں اور کم سے کم اپنے آپ کو اس لائق کر لوں کہ ویسٹ ایشین اسٹڈیز میں اور اسلامی دنیا کے متعلق جو علوم ہیں وہ چاہے سوشل سائنسز کے ہوں، ظاہر ہے کہ زبانوں سے تو میرا تعلق نہیں ہے اور نہ اسلامیات سے ہے لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں سَر اور دوبارہ وعدہ کرتا ہوں آپ سے کہ بچے ہوئے وقت میں مَیں پوری کوشش کروں گا اور یہ میرا خراجِ عقیدت ہو سکتا ہے مقبول صاحب کے لیے جنہوں نے بڑی خوش دلی سے میرا تقرر کیا تھا۔

جہاں تک مقبول صاحب کی شرافت نفسی کا سوال ہے علمی حیثیت کا تو مَیں ان کے علم کے بارے میں اس لیے تبصرہ نہیں کر سکتا کہ جو ان کے مشاغل تھے یعنی عربی کے استاد تھے، اس کے بعد انہوں نے اسلامیات میں اور عرب جغرافیہ میں جو کام کیا جس کا مجھے علم ہے۔ بہت سے کام ایسے ہیں جو میرے آنے کے بعد انہوں نے شروع کیے تھے اور پایۂ تکمیل تک پہنچے لیکن ان میں میری اتنی دسترس نہیں ہے کہ ان پر کوئی تبصرہ کر سکوں۔ ہاں میں ضرور کہوں گا کہ مَیں نے آنکھ کھول کر دیکھا علی گڑھ میں انہیں ایک بڑے اسکالر کی حیثیت سے ان کا شمار ہوتا تھا۔ اس وقت دوسرے ساتھیوں کے ساتھ جن میں سے کئی حضرات یہاں تشریف فرما ہیں۔ تو ایک بڑے اسکالر کی حیثیت سے مَیں ان سے متعارف ہوا۔

ہندستان میں اس زمانے میں جو اسکالرس تھے تو ظاہر ہے یورپ کے دوسرے حصوں میں بھی علم تھا۔ ڈاکٹر......صاحب تشریف فرما ہیں جنہوں نے جرمنی میں تعلیم پائی۔ کچھ لوگوں نے فرانس میں تعلیم پائی اور امریکہ کی جو روایت ہے تعلیم کی جو ظاہر ہے کہ اب بڑی روایت ہے۔

اس زمانے میں برطانیہ ایک ایسا ملک تھا، جہاں کے تعلیمی ادارے دنیا کے مایہ ناز تعلیمی ادارے تھے اور جو لوگ وہاں تعلیم حاصل کر سکتے تھے، جن کی ریسرچ اور تعلیم کی ٹریننگ ہوتی تھی، بڑی استقامت ہوتی تھی اور بڑی اچھی ٹریننگ سمجھی جاتی تھی اور ہمارے ڈاکٹر صاحب میں آج بھی یہی لفظ استعمال کرتا ہوں کہ ہمارے ڈاکٹر صاحب ان چند لوگوں میں سے تھے کہ جنہوں نے اپنی ریسرچ کی تعلیم اور بنیادی ٹریننگ انگلینڈ کے اُن اداروں میں پائی جہاں علم کی بڑی اہم روایت تھی اور اس کا مظہر یہ تھا کہ جب مَیں ان کی خدمت میں موجود رہتا تھا، مجھے فخر ہے، مَیں کلاس میں اور جلسوں میں اپنے طالب علموں سے کہہ چکا ہوں کہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ جن اساتذہ کی خدمت میں ہم نے وقت گزارا ہے ہم تمہارے لیے ویسے استاد نہیں بن سکے۔ یہ میرے لیے فخر کی بات ہے کہ ان اساتذہ کی خدمت میں مَیں نے وقت گزارا۔

مَیں یہ دیکھا کرتا تھا کہ اس زمانے میں جب علومِ اسلامیہ اور عربی کے بڑے بزرگ اساتذہ جن میں سے چند آج بھی یہاں تشریف فرما ہیں، یہاں مشاغل یہ ہوتے تھے کہ ایک تو ماخذوں کی صحت کا حد درجہ خیال رکھا جاتا تھا: مقبول صاحب لغات نکال کر بیٹھے ہوئے ہیں، اور لوگ بھی ہیں۔ کہتے تھے کہ مَیں نے فلاں جگہ سے نوٹ کیا ہے تم انہیں چیک کرنا، دوبارہ چیک کرنا۔ دوسری بات تھی زبان کی صحت۔ عربی کے ایک ایک لفظ کے مصادر تک جانا اور جس میں ایک صاحب جو ظاہر ہے کہ اب نہیں ہیں یہاں حافظ غلام مصطفیٰ صاحب اکثر تشریف لاتے تھے اور شروانی صاحب اور دوسرے اساتذہ تھے کہ جن کے ساتھ بیٹھ کر، اسی کمرے میں مقبول صاحب ہوتے تھے۔ ڈکشنری نکل رہی ہے۔ خیال یہ ہوتا تھا کہ اسکالرشپ میں کوئی چانس نہیں لینا چاہیے کہ جو بات ہم نے لکھ دی ہے تو کہیں ایسا نہ معلوم ہو کہ بعد میں وہ غلط ہو۔ اس میں کوئی بداحتیاطی برتی گئی ہو۔ تو اس زمانے میں برٹش اسکالر یا کہیے برطانیہ میں یہ روایت تھی۔ اس روایت کو وہ علی گڑھ میں لائے، مَیں سمجھتا ہوں کہ مقبول صاحب نے جو چیزیں لکھی ہیں، اس میں بہت محنت کیا کرتے تھے اور مجھ سے کہا کرتے تھے کہ جب مَیں انگلینڈ گیا تو سب سے پہلے جوان کے پروفیسر استاد تھے، پروفیسر گب، کہنے لگے کہ انہوں نے مجھ کو بلایا اور کہا کہ کچھ دنوں جا کر تم گھوم پھر لو، نئے ملک میں آئے ہو۔ ہفتے آٹھ روز کے بعد ایک مخطوطہ دیا اور کہنے لگے کہ اس کا ترجمہ کیجیے۔ کہتے ہیں کہ مَیں لمبے عرصے تک اس کا ترجمہ کرتا رہا اور خوش خوش ان کے پاس گیا کہ جیسے میرا کام بہت آگے بڑھ گیا اور مَیں نے کہا کہ مَیں نے ترجمے کا کام پورا کر لیا ہے تو کہنے لگے کہ اچھا اب آپ اس لائق ہو گئے ہیں کہ ریسرچ کا کام شروع کریں۔ آپ غور فرما رہے ہیں کہ اتنے عرصے کام کرنے کے بعد استاد کہہ رہے ہیں "I think now you can really start research" تو مقبول صاحب کہنے لگے کہ یا اللہ اب ریسرچ کا کام شروع کرائیں گے، پی ایچ ڈی کا یا جو بھی ریسرچ ہو یعنی ڈی لٹ وغیرہ کا۔ لیکن مقبول صاحب کہنے لگے کہ اس گراؤنڈنگ سے مجھے یہ فائدہ ہوا کہ چھ مہینے نو مہینے کے اندر ایسا لگا کہ از خود میرا کام پورا ہو گیا۔ ڈگری ایوارڈ ہو گئی۔

مَیں سمجھتا ہوں کہ میری بڑی خوش بختی ہے کہ چند اساتذہ کا جس میں سے کہ دو حضرات یہاں موجود بھی ہیں عابد رضا بیدار صاحب اور پروفیسر اگوانی اور ان کے ساتھ جن لوگوں کی شمولیت اس مقبول احمد میموریل لیکچر کی تحریک میں تھی۔ پروفیسر معظم وغیرہ ایک دو اساتذہ ایسے تھے کہ جنہوں نے یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ اس قسم کا لیکچر منعقد کیا جائے۔ مجھے خوشی ہے کہ آج وہ وقت آ گیا ہے کہ میرے کرم فرما استاد کی یاد میں یہ لیکچر انسٹی ٹیوٹ کیا جا رہا ہے اور آج اگر حسن اتفاق بھی ہے تو بہت مناسب ہے کہ یہ پہلا لیکچر ہے جو ظہور وارڈ کی اس بلڈنگ میں ہو رہا ہے، جہاں سے مَیں سمجھتا ہوں کہ مقبول صاحب نے اپنے کیریئر کی شروعات کی تھی، نہایت مناسب ہے اور مَیں بھی ان کے چھوٹوں کی حیثیت سے، ان کے شاگرد کی حیثیت سے، ہر ممکن کوشش کروں گا کہ اب یہ سلسلہ شروع ہوا ہے۔ اور بہت سے ایسے اساتذہ ہیں جن کی یاد میں ہم کو اور لیکچر قائم کرنا چاہئے۔ یہ کوتاہی ہے لیکن کم سے کم ایک بزرگ استاد کی یاد میں یہ لیکچر سیریز شروع ہو رہی ہے اور پروفیسر اگوانی یہ لیکچر دے رہے ہیں۔ یہ کم سے کم میرے لیے بڑی بات ہے۔ اس لیے کہ یہ نہ صرف مقبول صاحب کے دوست کی حیثیت سے بلکہ ہندستان کے بڑے اسکالر کی حیثیت سے یہی مناسب تھا کہ مقبول احمد میموریل لیکچر کی شروعات پروفیسر اگوانی کی لیکچر سے ہو۔

☆☆☆

THUS SPAKE SIR SYED

Raison d'être of Aligarh College
Why I established this Institution: Hindu Muslim, my two eyes

My Friends! You have just made a mention of Mohammedan Anglo-Oriental College in your address. I shall feel sorry if any body thinks that this college has been established so as to show discrimination between Hindus and Muslim. The main reason behind the establishment of this institution, as I am sure all of you know, was the wretched dependence of the Muslims, which had been debasing their position day after day. Their religious fanaticism did not let them avail the educational facilities provided by the government schools and colleges. It was, therefore, deemed necessary to make some special arrangement for their education. Suppose, for example, there are two brothers. One of whom is quite hale and hearty but the other is diseased. His health is on the decline. Thus it is the duty of all the brothers to take care of their ailing brother. This was the very idea that goaded me to establish the Mohammedan Anglo-Oriental College. But I am pleased to say that both the brothers get the same education in this College. All rights of the college appertaining to those who call themselves Muslims are equally related to those who call themselves Hindus without any reservations. There in no distinction whatsoever between Hindus and Muslim. Only one who strives hard can lay claim to get the award. Here in this college both Hindus as well as Muslims are entitled to get the stipends and both of them are treated at par as boarders. I regard both Hindus and Muslims as my two eyes.

(Speech at Lahore, February 3, 1884. Lecture p. 198)

Aligarh College/University built by participation of Hindu brethren

There is no doubt that *Madrasatul 'Ulum* is a means of national progress. By the word 'nation' here I do not mean Muslims alone but Hindus and Muslims both. Undoubtedly the institution was founded with a view to ameliorating the sad and pitiable condition of the Muslims which had deprived them of the drive and initiative for learning European sciences and literature. But both Hindus and Muslims are provided with facilities to study here. Both of them get the training best suited to the existing norms and needs in India. We may call ourselves Hindus or Muslims here in India. But in foreign countries we are all known as Indian natives. This is why the insult of a Hindu is an insult of the Muslim and the humiliation of a Muslim is a matter of shame for the Hindus. In the circumstances, we can never be held in respect unless both the brothers are bred and brought up together, get the same education together, and are provided with the same means of progress for their future career. With this sole objective in view, I established this institution called *Madrasatul 'Ulum'*. But for the co-operation and timely help of the people, I could scarcely have accomplished this task. I am greatly indebted to those who have helped me in this connection. In this respect, I am not grateful to Muslims as much as to Hindus who have extended helping hands by making liberal donations to their Muslim brothers. A number of Hindu names are inscribed on the walls and niches of the Institution so as to perpetuate their memories for how generously they had donated for their depressed Muslim brothers in their dire need.

(Speech at Amritsar, January 26, 1884. Lectures, p. 167)

All Indians are one Nation

You must have heard and studied in old books of history and you see today also that the word 'nation' has all along been used for the inhabitants of a particular country. For example, in Afghanistan people belonging to different clans and communities are called one nation. Similarly, all the heterogeneous communities of Iran are called Iranians or Persians. The Europeans too have different views and believe in different religions, but they are considered as one nation. Though men belonging to foreign land do pour in and settle down there, they are, nevertheless, called one nation. In short, the word 'nation' has always been used for the inhabitants of a country; no matter they have distinctive features.

O Hindus and Muslims! Do you belong to a country other than India? Don't you live on this soil and are you not buried under it or cremated on its *ghats*? If you live and die on this land, then, bear in mind, that 'Hindu' and 'Muslim' is but a religious word; all the Hindus, Muslims and Christians who live in this country are one nation.

--- Lecture at Gurdaspur, January 27, 1884. (*lecture, p. 176*)

By the word 'nation' I do mean both Hindus as well as Muslims. It is in this context that I refer here to the word 'nation'. For me it is immaterial as to what their religious belief is; because belief cannot be seen: but what we do take into account is the fact that all of us, no matter whenever Hindus or

Muslims, are sons of one and the same soil. Our benefits and advantages stem from one and the same source. On this account I always use the same word for both the communities living in India, that is to say, the word 'Hindus' or the inhabitants of India. When I was a member or the Legislative Council, the welfare of this very nation was my main anxiety.

--- Speech at Lahore, February 3, 1884. (*Lectures, p. 199*)

Our country cannot Progress without Secularism

It is the first and foremost duty of all the well-wishers of the country to strive for the welfare of all people irrespective of their caste or religion. For, just as human life and its health is not possible without the soundness of all the organs of the body, the prosperity of a nation also is not possible without all round progress of the country.

My friends! This India of yours is populated by two famous communities: the Hindus and the Muslims. These two communities stand in the same relation to India in which the head and the heart stand in relation to human body. To be a Hindu or a Muslim is a matter of belief and is a purely personal affair which has nothing to do with his external affairs or social relationship. It is well said that there are two sides of a human being; his inner idea or belief constitutes the first part and relates to God; whereas his moral or social behavior and mutual good-will and sympathy forms the second and connects him with all mankind. Thus, have concern with God alone as far as the inner matter of belief is concerned: and, in wordly affairs, have concern with the 'second' part only.

Dear Friends! India is the motherland of both of us (Hindus and Muslims), we breathe in and live on. The waters of the Holy Ganges and the Yamuna we both drink. It is the production of Indian soil that we eat and subsist on. We share in life and in death. Our long settlement in India has changed our original blood characteristics and has made us one. Our complexions have become very much alike. Our faces have so changed that they bear resemblance to one another. The Muslims have adopted hundreds of Hindus' rites and customs and the Hindus have taken to innumerable habits and manners of the Muslims. We drew so close to one another that we evolved quite a new language called Urdu – a language which was neither of the Muslims nor of the Hindus. So if we ignore the question of faith (which is a matter between man and God), we both, the Hindus and the Muslims are one nation as we belong to one land. It is through unity, reciprocal love and fellow-feeling that both of us and our country can make progress. Any amount of bitterness, hostility or ill-will is bound to disrupt our unity and spell doom. I am sorry for those people who do not get this point.

--- Lecture at Patna, January 27, 1883. (*Lectures, pp. 132-133*)

My approach is secular

You have also alluded in your address to my services in the Legislative Council during the period when I have had the honor of being a member of the Council. I cannot help saying that I feel that a man like myself was not worthy of having a seat in the Legislative Council of India, and of holding the great responsibility attached to that seat. I was myself aware of the difficulties that stood in my way; nevertheless, it was my earnest and sincere desire that I should faithfully serve my country and my nation. By the word *nation*, I mean both Hindus and Mahomedans. This is the way in which I define the word nation. in my opinion, it matters not whatever be their religious belief, because we cannot see anything of it, but what we see is that all of us, whether Hindus or Mahomedans, live on one soil, are governed by one and the same rule, have the sources of our advantage and equally share the hardships of a famine. These are the various grounds on which I designate both the communities that inhabit India by the expression Hindu nation; and while a member of the Legislative Council I had at heart the prosperity of this very nation. I feel very much gratified that you attach so much value to my insignificant services; and now in the end, I pray to God that He may grant progress of learning to our nation as defined above, which may spread light among our people and in our country.

--- Speech at Lahore, in reply to address presented by the Indian Association, February 3, 1884. (Lectures, p. 203)

Religious and Temporal Affairs cannot be mixed up

In this world there are two types of affairs: physical and spiritual or, in other words, religious and worldly. A true religion has no concern with worldly affairs, but a few moral principles which influence human behavior and may be worldly, are covered by it.

(*Maqalat-i Sir Syed, p. 56*)

***

SIR SYED THE GREAT

by Prof. Khaleeq Ahmad Nizami

Not only his virtues and achievements would be ever remembered, his message also would remain echoing down the corridors of time. He stood for : dynamic movement of society according to the needs of the time; supremacy of 'reason' in all matters, worldly and spiritual; liberty of conscience and freedom of expression; hard work and incessant struggle to make up leeway; secular approach in all spheres of human relationship and a concept of 'nation' which overrode all parochial considerations. In fact he has contributed many essential elements to the development of modern Indian society and is certainly of its most distinguished architects.

IQBAL AS TRANSLATED

by a great Alig Saiyidain sb (K.G. Sayyidain)

41. Cut your path with an axe of your own,
It is a sin to tread the beaten paths of others!
If you achieve something unique and original,
Even a sin becomes a virtue!

42. What is origin of thought and action?
An urge to revolution!
What is originality of thought and action?
A renaissance of national life!
It is the source of life's miracles
Transforming granite into the purest of pearls!

43. Would you esnare the phoenix of knowledge?
Rely less on belief and learn to doubt.

44. Science is an instrument for the preservation of life,
Science is a means of establishing the self,
Science and Art servants of life —
Slavers born and bred in its house.

45. Last night I heard the book-worm lament
To the moth in my library:
I have lived inside the pages of the Sina's books,
And seen many volumes of Farabi's writings,
But the secret of life I have failed to grasp,
For my days are still dark and sunless!
Aptly did the half-burnt moth rejoin:
Thou canst not find this secret in a book.
It is yearning that quickens the tempo of life
And endows it with wings to soar.

46. I hold that knowledge and intelligence cheap
Which takes away the crusander's sword and shield.

47. May God fire thee with the force of a tempest,
For the waters of thy sea are calm and still;
The book cannot be thy solution,
For, thou art only a reader; it has not been revealed to you.

48. Life is preserved by purpose;
Because of the goal its caravan tinkles!
Life is latent in seeking.
Its origin is hidden in Desire!
Keep Desire alive in thy heart,
Lest thy handful of dust becomes a tomb!
Desire is a noose for hunting ideals,
A binder for the book of deeds!
It gives for the earth the power of soaring
It is a Khizr to the Moses of perception!
'Tis Desire that enriches life,
And the intellect is a child of its womb!

49. 'Tis Desire that makes the blood of man run warm,
By the lamp of Desire this dust is enkindled.
Life is occupied with conquest alone
And the one charm for conquest is Desire.

50. Dest thou know the secret of life?
Do not, then, seek or accept a heart
Unpricked by the thorn of Desire.

51. What shall do? My nature is averse to rest;
My heart is impatient like the breeze in the poppy field;
when the eye beholds an object of beauty
The heart yearns for something more beautiful still;
From the spark to the star, from the star to the sun
Is my quest;
I have no desire for a goal,
For me, rest spells death!
With an impatient eye and a hopeful heart
I seek for the end of that which is endless

52. What does the poppy bring?
Neither the wine nor the flagon!
Its endowment is only the infinite yearning of its heart!

53. Feast not on the shore, for there
Softly breathes the tune of life.
Grapple with the wave and dare!
Immortality is strife.

54. Leave out the story of the restless moth,
whose tale of burning repels my ears:
That moth alone is a true moth
Who is active in striving and can swallow the flame

55. How aptly did Sikandar remark to Khizr:
Participate actively in the struggle of life!
You watch the battle from the edge of the battle-field:
Die in the thick of the fight and gain everlasting life.

56. If thou art wounded, make thy pain thy remedy!
Accustom thyself to thorns, that thou mayst become
Entirely one with the garden.

57. The secret of a joyous life is to live dangerously!
Strike thyself again on the whetston,
So as to become sharper than the well-tempered sword.
Danger tests one's strength and capacit
An is the touchstone of the powers of the mind and the body.

***